عصمت انبیاء سے متعلق چند آیات کی وضاحت

ثاقب اکبر*

کلیدی کلمات: عصمت، اسرائیلیات، ترک اولیٰ، ستارہ پرست، قتل عمد، حسنات الابرار، اوّاب۔

خلاصہ

نبوت سے متعلق عقلی موضوعات میں سے ایک عصمت انبیاء کا موضوع بھی ہے جو ضرورت نبوت کی بحث سے مربوط ہے . یہ موضوع نقلی ادلہ سے زیادہ عقلی ادلہ کے ذریعے بہتر انداز میں سمجھا جاسکتا ہے۔قرآن مجید میں قصص انبیاء کے ضمن میں کچھ ایسی آیات بھی نظر آتی ہیں جو سطحی نظر میں انبیائے کرامؑ کی عصمت کے منافی نظر آتی ہیں۔انہی آیات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ لوگ شک وشبہ میں پڑ گئے ہیں۔اس مقالے میں اسی نازک مسئلہ پر بحث کی گئی ہی اور اس موضوع سے مربوط بعض جعلی روایات اور اسرائیلیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ضمنی طور پر "ترک اولیٰ" کے موضوع کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔اس کے بعد قرآن مجید میں بعض انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں نازل ہونے والی سوال انگیز آیات کا مفہوم اور مراد سمجھنے کی سعی کی گئی ہے۔ لہٰذا حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت یونسؑ، حضرت یوسفؑ سے متعلق آیات کی وضاحت کرتے ہوئے ان انبیائے کرام علیہم السلام کی تنزیہ کی گئی ہے۔

عصمت انبیاء کا نظریہ چونکہ ضرورت نبوت سے مربوط بحث کا حصہ ہے جو اپنے مقام پر ایک عقلی موضوع ہے یعنی پہلے ہم نبوت کی ضرورت کو عقل سے ثابت کرتے ہیں اور بعد میں کسی شخصیت کے دعویٰ نبوت کا جائزہ لیتے ہیں۔اس لیے اصولی طور پر عصمت انبیاء کا نظریہ بھی پہلے مرحلے میں عقلی دلائل پر استوار ہے چونکہ عقل ہی ضرورت انبیاء کا ادراک کرتی ہے اور اس امر کا بھی ادراک کرتی ہے کہ ایک الٰہی ہادی کو کن بنیادی خصوصیات اور صفات کا حامل ہونا چاہیے۔تاہم قرآن حکیم میں بعض ایسی آیات آئی ہیں جنھیں ان کے درست فریم ورک میں نا سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ عصمت انبیاء کے بارے میں شک و شبہہ میں پڑ گئے ہیں۔ہم سمجھتے ہیں کہ بعض ضعیف، جعلی روایات اور اسرائیلیات بھی اس ناقص فہم کا سبب بنی ہیں اور یہی روایات ہمارے تفسیری لٹریچر میں شامل ہو گئی ہیں۔پیش نظر سطور میں ہم نے بعض انبیائے کرام کے حوالے سے موضوع کی مناسبت سے آیات کے افہام و تفہیم کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر ہم اپنی گفتگو کا آغاز مولانا حمید الدین فراہی کے نقطہ نظر کو نقل کرنے سے کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

ہمارے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ گناہ اور برائیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک ابرار کے گناہ، دوسرے عام لوگوں کے گناہ۔ بھول چوک کے قسم کی چیزیں جو انبیاء کی طرف منسوب ہیں وہ پہلی قسم کے تحت آتی ہیں۔اگرچہ یہ بات بہت ہی باوزن ہے لیکن اس کی تفصیل اور وضاحت کی ضرورت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بندہ کا مواخذہ اس چیز میں ہوتا ہے جو اس پر واجب ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ حیوانات پر وہ احکام لاگو نہیں ہوتے جو ہم پر عائد ہوتے ہیں۔اسی طرح مختلف امتوں کی گرفت ان چیزوں میں ہوئی جو ان پر فرض کی گئی تھیں۔یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ایسے ہی انبیاء سے ان امور میں مواخذہ ہوا جن کے وہ

*صدر نشین، البصیرہ ٹرسٹ، اسلام آباد۔

حامل بنائے گئے تھے۔ عزم، بیداری اور ثابت قدمی اسی سلسلہ کی چیزیں ہیں۔ اگر ان میں کوئی کمزوری ان کو لاحق ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قدم پھر جما دیے اور انھیں غلطیوں سے محفوظ رکھا۔[1]

ممکن ہے بعض علماء مولانا فراہی کے لفظ ''کمزوری'' سے اتفاق نہ کریں۔ بعض علماء نے ''افضل'' و ''فاضل'' کے لفظ استعمال کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں بعض انبیاء کرامؑ سے کچھ امور ایسے سرزد ہوئے جنھیں ''فاضل'' تو کہاجاسکتا ہے لیکن ''افضل'' نہیں جبکہ انبیاؑ کے مقام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ''افضل'' کو اختیار کریں۔ علمائے کرام کا ایک گروہ کہتا ہے کہ انبیاء کرامؑ سے گاہے ''ترک اولیٰ'' ہوجاتا ہے یعنی جو کام اولویت رکھتا تھا اور ان کے شایان شان تھا اس کے بجائے کم تر درجے کا کام ہو گیا۔ ہماری رائے میں یہاں لفظی فرق ہے ورنہ ''اولیٰ'' اور ''افضل'' کے کلمات ایک ہی مفہوم بیان کرتے ہیں۔ ہمارا نظریہ ہے کہ گاہے انبیاؑ کو ''عدم التفات'' یا ''عدم توجہ'' کی صورت پیش آجاتی ہے۔

شاید بیشتر مسائل جو انبیاعلیہم السلام کے حوالے سے قرآن حکیم میں ایسے مذکور ہیں جن پر وہ بعد میں متوجہ ہوئے کہ انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، یا معاملے کی نوعیت ایسی نہ تھی جیسی انھوں نے سمجھی اور وہ بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے توجہ دلائے جانے پر ملتفت ہوگئے اور تیز رفتاری سے منشائے الٰہی کی طرف لوٹ گئے، تو اس پر عدم توجہ یا عدم التفات کے الفاظ زیادہ صادق آتے ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان کے مرتبے اور منصب کے پیش نظر ہی ایسے ہر معاملے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آئندہ سطور میں بعض انبیاء کے حوالے سے ایسی ہی سوال انگیز آیات کا مفہوم و مراد سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں سوالات

حضرت نوحؑ کے بارے میں بعض آیات کی روشنی میں ان کی عصمت کے حوالے سے سوال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیت میں حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار کرنے کے لیے ہدایات دی جارہی ہیں :

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡہَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَ اَہۡلَکَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡہِ الۡقَوۡلُ وَ مَنۡ اٰمَنَ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ (ھود/۴۰)

ترجمہ : "ہم نے کہا سوار کرلو اس کشتی میں ہر چیز کے دو جوڑے اوراپنے گھر والوں کو مگر جس کے بارے میں پہلے بات ہوچکی ہے اور جو ایمان لائے ہیں جبکہ نوحؑ کے ساتھ چند افراد کے علاوہ ایمان نہیں لائے تھے۔"

آیت کے آخری حصے میں خبر دی جارہی ہے کہ ایمان لانے والے تھوڑے سے افراد تھے۔ اس حکم کے آنے کے بعد حضرت نوحؑ نے اپنے گھر والوں کو حکم دیا کہ وہ کشتی میں سوار ہوجائیں تاکہ وہ نجات پا سکیں لیکن ان کے ایک بیٹے نے نافرمانی کی اور کہنے لگا کہ میں پہاڑی پر چڑھ جاؤں گا اور ہلاک ہونے سے بچ جاؤں گا۔ اس پر حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ آج اللہ کے حکم سے بچنے والا کوئی نہیں ہے، سوائے اس کے جس پر وہی رحم کرے۔ بہرحال اس نے حضرت نوحؑ کی بات نہیں مانی اور ان دونوں کے درمیان پانی کی موج حائل ہو گئی اور وہ ڈوب گیا۔ یہ سارا واقعہ اسی سورہ ہود میں بیان کیا گیا ہے۔ (آیت نمبر۴۲و۴۳)۔ جب حضرت نوحؑ کا بیٹا ڈوبنے لگا تو حضرت نوحؑ نے اپنے پروردگار سے اسے بچانے کی درخواست جن الفاظ میں کی اسے یوں بیان کیا گیا ہے : وَنَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّہٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَہۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَکَ الۡحَقُّ وَ اَنۡتَ اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ

ترجمہ : "نوح نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ میرا بیٹا ہے جو میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ برحق ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والا ہے۔" (ھود/۴۵)

حضرت نوحؑ کی اس درخواست پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا :

قَالَ يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ‌ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ‌ فَلَا تَسۡـئَلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ (ھود/ ۴۶)

ترجمہ: "(اس پر) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نوح! وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے بلکہ وہ تو ناصالح عمل ہے تو مجھ سے ایسا سوال نہ کر جس کے متعلق تجھے علم نہیں ہے۔میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ توجاہلوں میں سے نہ ہو۔"

حضرت نوحؑ نے عرض کیا:

قَالَ رَبِّ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـئَلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۔(ھود/ ۴۷)

ترجمہ: "کہا: اے میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں خود تجھ سے اس بات سے کہ تجھ سے سوال کروں ایسا جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور نہ رحم کرے تو میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوجاؤں۔"

حضرت نوحؑ کی عصمت کے حوالے سے ان آیات کی روشنی میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک کافر اور مشرک شخص کی نجات کے لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی اور ایک نبی ہونے کی حیثیت سے انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔اس کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل نکات قابل غور ہیں:

(i)عصمت انبیاء کے حوالے سے عقلی و نقلی دلائل جو اپنے مقام پر پیش کیے گئے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی ان آیات کا مفہوم متعین کرنا ہوگا۔

(ii)عصمت انبیاء کے حوالے سے یہ اصولی بات یہ ہے کہ انبیاء اللہ کی نافرمانی کا ارادہ نہیں کرتے۔مندرجہ بالا واقعے میں کہیں بھی اس اصول کی نفی نہیں ہوتی اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت نوحؑ نے کہیں بھی اللہ کی نافرمانی کا کوئی ارادہ کیا ہو۔(نعوذباللہ من ذالك)

(iii) حضرت امام محمد باقرؑاور امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت میں آیا ہے کہ یہاں جس فرد کو نوحؑ کا بیٹا کہا گیا ہے وہ درحقیقت آپ کی ایک بیوی کا پہلے شوہر سے بیٹا تھا جسے قبیلہ طیّ کے رواج کے مطابق بیٹا کہا گیا ہے۔[2]

(iv) امام محمد باقرؑ سے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت نوحؑ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا منہ بولا بیٹا کافروں کا ہم عقیدہ ہے۔[3]

(v)آیت نمبر۴۲ میں حضرت نوحؑ کا یہ فرمانا:

لَا تَكُنۡ مَّعَ الۡكٰفِرِيۡنَ (ھود/ ۴۲)

ترجمہ: "کافروں کے ساتھ مت ہو۔"

ظاہر کرتا ہے کہ انھیں اس کے کفر کا علم نہیں تھا ورنہ وہ ''مع'' کے بجائے ''من'' کہتے۔

(vi) حضرت نوحؑ کا یہ کہنا: اَنۡ اَسۡـئَلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ بھی اس امر کی حکایت قرار پا سکتا ہے کہ انھیں یا یہ علم نہیں تھا کہ بیوی کا بیٹا اہل میں سے نہیں ہے یا پھر وہ اس کے کفر کو نہیں جانتے تھے۔

ان روایات اور توجیہات کو نظر انداز کردیا جائے تب بھی ہمارے بیان کیے گئے اصول کے مطابق حضرت نوحؑ کی عصمت پر مذکورہ آیات کی روشنی میں کوئی حرف نہیں آتا۔

حضرت ابراہیمؑ کی عصمت کے بارے میں سوالات

حضرت ابراہیمؑ نے ایک موقع پر اپنے شہر کے مضافات میں واقع بت خانے کے تمام بتوں کو توڑ کر کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا۔جب شہر کے لوگ ایک میلے سے واپس آئے اور بت خانے میں پہنچے تو انھوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے بتوں کو دیکھا۔کسی نے حضرت ابراہیمؑ کا نام لیاتو انھیں بلاکر پوچھا گیا۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (انبیاء/۶۲-۶۳)

ترجمہ: "انھوں نے کہا: اے ابراہیمؑ !کیا ہمارے خدائوں کے ساتھ یہ تم نے کیا ہے؟کہا:ان کے بڑے نے یہ کیا ہے،ان سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں۔"

اس حوالے سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب یہ کام خود کیا تھا تو انھوں نے اسے بڑے بت کے ذمہ کیوں لگایا اور یہ ایک جھوٹ ہے۔اس کی وضاحت کچھ یوں یہ ہے:

حضرت ابراہیمؑ نے جو کچھ کہا وہ دراصل ایک اندازِ بیان ہے جو مخاطبین کی عقل و خرد کو جھنجھوڑنے کے لیے ہے، ورنہ ہر شخص جو زبان و بیان کے اصولوں کو جانتا ہے وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت ابراہیمؑ نے (نعوذ باللہ) جھوٹ بولا تھا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ بت کسی کو نہ نفع پہنچا سکتاہے نہ نقصان۔لہٰذا یہ ممکن نہ تھا کہ بڑے بت نے چھوٹوں کو توڑا ہوتا۔حضرت ابراہیمؑ جو اعتراف مخاطبین سے کروانا چاہتے تھے وہ بے ساختہ ان کی زبانوں سے جاری ہو گیا اور حضرت ابراہیمؑ کا مقصد پورا ہوگیا۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۰﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۱۲﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (انبیاء/۶۴ تا ۶۷)

ترجمہ: "یہ سن کر انھوں نے اپنے دل میں غور کیا اور کہنے لگے کہ یقیناً تم ظالم ہو پھر انھوں نے سر جھکاکر (ابراہیمؑ سے) کہاکہ تو تو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔اس پر ابراہیم کہنے لگے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر کیا ان کی عبادت کرتے ہو کہ جو تمھیں نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان،افسوس ہے تم پر اور ان پر کہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کرتے ہو۔کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟"

لطف کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ سے یہ نہیں کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو (نعوذباللہ) بلکہ انھوں نے تو کہا کہ تم تو جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔(تو پھر ہم ان سے کیسے پوچھیں)۔

حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ایک واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے جب رات کی تاریکی چھا گئی تو ستارہ دیکھ کر کہا: یہ میرا رب ہے اور جب وہ ڈوب گیا تو کہا: مجھے ڈوب جانے والے اچھے نہیں لگتے۔پھر جب چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا :یہ ہے میرا رب پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہنے لگے: اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دے تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہوجائوں گا۔پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا: یہ ہے میرارب یہ تو سب سے بڑا ہے پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہنے لگے: اے میری قوم !جنھیں تم شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔میں نے تو ہردوسری چیز سے ہٹ کر اپنا رخ اس کی طرف کر لیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

قرآن حکیم کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام/۷۶تا۷۹)

ان آیات کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں حضرت امام رضاؑ نے فرمایا کہ یہ سب انکار کے طور پر تھا نہ کہ اقرار اور خبر دینے کے طور پر۔[4]

حقیقت یہ ہے کہ ستارہ پرستوں اور مظاہر آسمانی کی پوجا کرنے والوں کو حقیقی خدا اور خالق کائنات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے یہ حضرت ابراہیمؑ کا خوبصورت طرز استدلال تھا۔ استدلال کا نتیجہ بھی آخر میں واضح طور پر آگیا ہے۔اس کے بعد ان آیات کو اس امر کے لیے دلیل بنانا کہ حضرت ابراہیم پہلے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے خدائے واحد قہار کو نہ پہچانتے تھے فکر کی کوتاہی و نارسائی کے سوا کچھ نہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے بارے میں سوالات

حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ایک شخص کے قتل کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ○ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ (قصص/۱۵-۱۷)

ان آیات کا رائج ترجمہ کچھ یوں ہے:

ترجمہ: "اور وہ شہر میں ایسے وقت میں داخل ہوئے جب وہاں کے لوگوں کو خبر نہ تھی تو انھوں نے وہاں دیکھا کہ دو افراد آپس میں لڑ رہے ہیں۔ان میں سے یہ ایک ان کے دوستوں میں سے تھااور یہ دوسرا ان کے دشمنوں میں سے۔پس جو ان کے دوستوں میں سے تھا اس نے انھیں اس شخص کے خلاف مدد کے لیے پکارا جو ان کے دشمنوں میں سے تھا۔تو موسیٰ نے اسے ایک مکّا دے مارا جس نے اس کا فیصلہ کر دیا۔کہا: یہ شیطان کی کارستانی کا نتیجہ ہے بلاشبہ وہ کھلا ہوا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔کہا: اے پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا،اب تو مجھے بخش دے تو اس نے انھیں بخش دیا یقیناً وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔موسیٰ کہنے لگے: اے میرے پروردگار! اس بنا پر کہ تو نے مجھے اپنی نعمت سے نوازا ہے میں کبھی مجرموں کا مدد گار نہیں ہوں گا۔"

ان آیات کے حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ اول تو حضرت موسیٰ نے ایک شخص کو بے گناہ قتل کر دیا جس کا اقرار خود انھوں نے یہ کہہ کر کیا کہ اے میرے رب! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ثانیاً انھوں نے تسلیم کیا کہ یہ شیطانی عمل تھا۔ گویا شیطان جو کہ انسان کا دشمن ہے اس نے حضرت موسیٰ کو بھی بھٹکا دیا۔

ان آیات کریمہ کا حقیقی مفہوم سمجھنے کے لیے ان سے پہلے اور بعد کی بھی چند آیات پر نظر رکھنا ضروری ہے۔اسی طرح اس واقعے کی طرف اشارہ کرنے والی چند آیات بعض دیگر سورتوں میں بھی آئی ہیں،انھیں بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ویسے تو ان آیات میں بہت سے نکات موجود ہیں البتہ ہم چونکہ ''عصمت انبیاءؑ'' کے موضوع کے ضمن میں ان کا مطالعہ کر رہے ہیں اس لیے ہم اپنے آپ کو اسی پہلو تک محدود رکھنے کی کوشش کریں گے۔اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات قابل غور ہیں:

۱۔ ''فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى'' (پس موسیٰ نے اسے مکّا رسید کیا) سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا ارادہ اس شخص کو قتل کرنا نہ تھا مگر اس مکّے نے اس کا کام تمام کردیا جسے قرآن مجید نے ''فَقَضٰى عَلَيْهِ'' کی عبارت میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ قتل عمد نہ تھا بلکہ قتل خطا تھا۔

۲۔ جس نے مدد طلب کی اسے " مِنْ شِيْعَتِهٖ " (حضرت موسیٰ کے شیعوں اور پیرکاروں میں سے) کہا گیا ہے اور جس کے خلاف اس نے مدد طلب کی اسے ''مِنْ عَدُوِّهٖ " (حضرت موسیٰ کے دشمنوں میں سے) قرار دیا گیا ہے۔ گویا ایک آپ کے دین پر تھا اور دوسرا فرعون کے دین پر۔ ایک کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا جو اس دور میں مظلوم اور مستضعف تھے اور دوسرے کا تعلق برسراقتدار قبطی قبیلے سے تھا جو بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرتا اور عورتوں کو خدمت کے لیے زندہ رکھتا تھا اور نہایت ظلم و سفاکی سے بنی اسرائیل کو دبائے ہوئے تھا۔ گویا مدد کے لیے پکارنے والا تھا تو مظلوم ہی اور جو اسے دبائے ہوئے تھا وہ ظالم ہی تھا، یہ الگ بات ہے کہ حضرت موسیؑ کو اس موقع پر اس کی مدد کے لیے اقدام نہیں کرنا چاہیے تھا، جیسا کہ دیگر آیات کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے چونکہ حضرت موسیٰ کو ایک انفرادی مسئلے اور مشکل کے حل کے لیے کردار ادا نہیں کرنا تھا بلکہ انھیں عظیم تر کردارادا کرنا تھا جس کی وجہ سے آپ کو طاقت و شجاعت، علم وحکمت اور مظلوموں کی مدد کے جذبے سے نوازا گیا تھا۔

۳۔ گھونسا پڑنے پر جو وہ قبطی جان سے گیا تو حضرت موسیؑ نے کہا:"یہ شیطان کا عمل ہے بلاشبہ وہ کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے"۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیؑ نے کس عمل کو شیطانی عمل قرار دیا، قرآنی تعبیرات اور بعض روایات کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں شک نہیں رہتا کہ ان دونوں کا آپس میں جھگڑنا ایک شیطانی عمل تھا جس میں بے خبری میں شہر میں داخل ہونے والے موسیؑ بھی جاپڑے، جس کا اعتراف اگلی آیت میں حضرت موسیؑ کی طرف سے کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں کتاب عیون کی ایک اورروایت قابل توجہ ہے۔اس میں علی بن محمد بن جہم سے روایت کیا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں مامون کی مجلس میں حاضر ہوا۔ اس وقت امام رضاؑ بھی اس کے پاس بیٹھے تھے۔مامون نے آپ سے کہا: اے فرزند رسولؐ! کیا آپ کا یہ اعتقاد نہیں کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایسا ہی ہے۔

وہ کہنے لگا: تو پھر فرمائیں کہ آیت "فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ" کا کیا معنی ہے؟آپ نے فرمایا: موسیٰ فرعون کے ایک شہر میں اس وقت داخل ہوئے کہ جب وہاں کے لوگ آپ کے آنے سے غافل تھے۔ یعنی مغرب و عشاء کے مابین کا وقت تھا۔ اس وقت آپ نے دو آدمیوں کو دیکھا کہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ ایک آپ کے پیروکاروں میں سے تھا اور دوسرا دشمنوں میں سے۔ دشمن کو آپ نے اللہ کے حکم سے پرے کردیا اور اسے ایک مکّا بھی رسید کیا جس کے نتیجے میں وہ مر گیا تو وہ اپنے آپ سے کہنے لگے: یہ شیطانی عمل میں سے تھا یعنی ان دونوں آدمیوں کے درمیان جو جھگڑا رونما ہوا یہ شیطان کا کیا دھرا تھا۔ آپ کی یہ مراد تھی، نہ یہ کہ میرا اسے مار دینا شیطانی عمل میں سے تھا " اِنَّهٗ " یعنی وہ شیطان گمراہ کرنے والا اور آشکار دشمن ہے۔اس پر مامون کہنے لگا: پس موسیٰ کے یہ کہنے کا کیا مطلب ہے؟

رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ

ترجمہ: "اے میرے رب! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا میری مغفرت فرما۔"

حضرت امام رضاؑ نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ اے میرے رب! مجھے شہر میں اس کے علاوہ کسی اور موقع پر داخل ہونا چاہیے تھا پس مجھے اپنے دشمنوں سے چھپا لے (کیونکہ غفران کا معنی چھپانا ہے) تاکہ میں ان کے ہاتھ نہ لگ سکوں اور وہ مجھے قتل نہ کردیں۔ خدا نے بھی ایسا ہی کیا، انھیں دشمنوں کی نظر سے چھپا لیا کیونکہ وہ خوب چھپانے والا مہربان ہے(فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ

الرَّحِیۡمُ)۔اس پر حضرت موسیٰ نے کہا: رَبِّ بِمَآ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ۔۔۔اے میرے رب! تو نے مجھے جو یہ نعمت اور طاقت بخشی ہے کہ میں نے ایک مکے سے ایک دشمن کو مار دیا ہے اس کے شکرانے کے طور پر جب تک میں زندہ رہوں گا مجرموں کا مددگار نہیں ہوں گا بلکہ اس قوت کو ان کے خلاف بروئے کار لاؤں گا تاکہ تو راضی ہو۔

حضرت یونسؑ کے بارے میں سوال

حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بلند مرتبہ رسولوں میں سے تھے۔ان کے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی نظیر نہ اگلوں میں ملتی ہے نہ پچھلوں میں۔سورہ مبارکہ انبیاء میں ہے:

وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ (انبیاء/۸۷)

ترجمہ:"اور ذاالنون (کو یاد کیجیے) جب وہ غصے کے عالم میں اپنی قوم کے مابین میں سے چلے گئے،انھیں یہ گمان تھا کہ ہم ان کی گرفت نہیں کریں گے پھر کچھ یوں ہوا کہ انھوں نے تاریکیوں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی الہ نہیں تو پاک ہے میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔"

عصمت انبیاء کی بحث میں یہ آیت بھی سوال انگیز ہے کہ حضرت یونسؑ نے تو خود اعتراف کیا کہ وہ ظالموں میں سے ہیں، کیا ان کا یہ اقرار عصمت انبیاء کے عقیدے کے منافی نہیں؟ویسے تو اس واقعے کی تفصیلات ہیں، جنھیں سورہ یونس اور سورہ قصص کی متعلقہ آیات میں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے لیکن ہم یہاں زیر بحث موضوع کے حوالے سے اختصار سے کچھ بیان کریں گے۔

حضرت یونسؑ ایک عرصے تک اپنی قوم کو توحید کی دعوت دیتے رہے لیکن قوم بت پرستی سے باز نہ آئی۔آپ نے پوری دلسوزی اور دل جمعی سے حق کا پیغام اس تک پہنچایا لیکن اس نے درخوراعتنا نہ جانا۔جیساکہ روایات میں آیا ہے کہ صرف دو افراد نے آپ کی دعوت کو قبول کیا۔ان میں سے ایک "عابد" تھا اور دوسرا"عالم"۔عابد نے حضرت یونسؑ کی مساعی کو بے اثر پایا اور آپ کو دل آزردہ،تو مشورہ دیا کہ اب آپ اللہ سے اس قوم کے لیے عذاب کی دعا کریں۔نافرمان قوموں پر پہلے بھی عذاب آتا رہا تھا۔حضرت نوحؑ اور حضرت صالحؑ کی قوموں پر آنے والے عذاب کے واقعات ہو گزرے تھے۔حضرت یونسؑ نے ایسا ہی کیا۔ابھی عذاب کے ابتدائی آثار دکھائی دینے لگے تھے کہ حضرت یونسؑ اس بستی سے غصے کے عالم میں نکل کھڑے ہوئے۔ان کا گمان یہی تھا کہ اب ان کی اصلاح کا امکان باقی نہیں رہا لہٰذا میرا یہاں سے نکل جانا ہی مناسب ہے اوراس پر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی گرفت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

لیکن ان کا یہ گمان درست ثابت نہ ہوا۔آپ ناراض ہو کر جب وہاں سے نکلے تو بستی میں موجود اس مومن عالم نے قوم کو متوجہ اور متنبہ کیا کہ دیکھو عذاب کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔اللہ کے نبی یونس بھی تم سے سخت ناراض ہو کر چلے گئے ہیں۔سب اپنے آپ کو اللہ کے حضور فوراً پیش کردو۔دل سے توبہ کرو تو ممکن ہے یہ عذاب تم سے ٹل جائے۔اس کی یہ بات اثر کر گئی۔ان کے مرد،عورتیں اور بچے سب کھلے میدان میں اکٹھے ہوئے۔توبہ کی،اللہ کے حضور گڑگڑائے اور اس کی توحید پر ایمان لے آئے۔دیکھتے ہی دیکھتے عذاب الٰہی کے آثار ان کے سروں سے برطرف ہو گئے۔

حضرت یونسؑ جو اللہ کے برگزیدہ نبی تھے انھیں چاہیے تھا کہ ابھی کچھ اور انتظار کرتے۔نبیوں سے اوراللہ کے خاص بندوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ استقامت اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کریں گے۔انھیں جلد مایوس نہیں ہونا چاہیے تھا۔ابھی ان کی

قوم میں اصلاح کی گنجائش باقی تھی۔جب عذاب یقینی ہوجاتا اور اللہ کی طرف سے انھیں بستی سے نکل جانے کا حکم ہوتا تو انھیں پھر نکلنا چاہیے تھا جیسا کہ حضرت لوط علیہ السلام اور دیگر انبیاء کی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔بڑے انسانوں سے توقعات بھی بڑی ہوتی ہیں۔گاہے وہ کام جو عام انسانوں کے لیے درست اور مناسب ہوتے ہیں بڑے انسانوں کے لیے مناسب نہیں ہوتے یہاں تک کہ کہا جاتا ہے" حسنات الابرار سیئات المقربین "یعنی نیک لوگوں کے ہاں جن کاموں کو حسنات کہا جاتا ہے اللہ کے مقربین کے لیے وہ سیئات میں سے شمار کیے جاتے ہیں۔

حضرت یونسؑ اپنی قوم سے ناراض ہوئے تو بستی سے نکل کر سمندر کے کنارے پہنچے۔یہ بستی عراق میں واقع تھی۔تاریخ کی کتابوں میں اسکا نام ''نینوا'' آیا ہے۔سمندر کے کنارے پہنچ کر آپ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔کشتی بیچ سمندر میں پہنچی تو خطرات میں گھر گئی۔ملاح نے کہا کہ اگر ایک شخص کم کردیا جائے تو باقی بچ سکتے ہیں۔یہ واقعہ مختلف صورتوں میں بیان ہوا ہے۔مختصر یہ کہ قرعہ اندازی کی گئی تو حضرت یونسؑ کا نام نکلا۔تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔یہاں تک کہ آپ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا گیا جہاں ایک بہت بڑی مچھلی نے آپ کو نگل لیا۔مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو ظلمات ہی ظلمات تھیں۔ایسی تاریکیاں کہ جن کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ رکھا۔وہاں آپ متوجہ ہوئے کہ آپ سے کیا ''انہونی'' سرزد ہو گئی ہے۔اسی کا اعتراف مندرجہ بالا آیہ مجیدہ میں ملتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی عظمت اور پاکی کا اعتراف کرتے ہوئے آپ نے اپنے بارے میں عرض کیا: انی کنت من الظالمین

اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے واقعے اور خود آیت مذکورہ سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

(۱) حضرت یونسؑ کا گمان یہی تھا کہ وہ ٹھیک اقدام کر رہے ہیں لہٰذا انھوں نے جو بھی قدم اٹھایا اپنے تئیں درست ہی سمجھا۔

(۲) ظاہراً بھی عذاب کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

(۳) حضرت یونسؑ کا اعتراف اللہ تعالیٰ کی عظمت، اپنی ذمہ داری کی حساسیت اور اس کی طرف عدم التفات کو سامنے رکھتے ہوئے تھا۔

(۴) کسی عام شخص سے اس طرح کا کام سرزد ہوجاتا تو شاید اللہ کے حضور قابل سرزنش قرار نہ پاتا لیکن اللہ کے نبی سے ایسا ہوا جو ان کے منصب اور مرتبے سے ہم آہنگ نہ تھا۔

(۵) نبی کوچونکہ ہر پہلو سے دوسروں کے لیے نمونہ بننا ہوتا ہے اس لیے ان سے اس طرح کا عدم التفات وقوع پذیر ہو جائے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ردعمل سامنے نہ آئے تو وہ دوسروں کے لیے نمونہ قرار پاتا ہے۔اس لیے حضرت یونسؑ اور بعض دیگر انبیاء کے بعض واقعات میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضروری ہو گیا کہ بندوں کے سامنے اصل حقیقت کھول کر رکھ دی جائے تاکہ ہر مسئلے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح ترین اور مقبول ترین مرتبے اور حقیقت کا اظہار ہو جائے۔یہی کچھ حضرت یونسؑ کے مذکورہ واقعے میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

(۶) یہاں یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ بعض انبیاء کے لیے قرآن حکیم میں'' اوّاب'' کا کلمہ استعمال کیا گیا ہے یعنی بار بار اور پلٹ پلٹ کر اللہ کی طرف آنے والے۔مذکورہ امور میں بھی انبیاء نے اللہ کے حضور اپنا ''اوّاب'' ہونا ثابت کیا ہے اور اس میں بھی وہ دیگر انسانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہیں۔

یوسفؑ کا ارادہ؟

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے حوالے سے بھی ایک سوال کا جواب یہاں ضروری ہے۔قرآن حکیم کی ایک آیت پر گہری نظر نہ ڈالنے کے باعث بعض مفسرین مشکل میں پڑ گئے ہیں۔آیت یہ ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف/ ۲۴)

اس آیہ مجیدہ کے ابتدائی حصے کو باقی آیت سے صَرفِ نظر کرکے بعض مفسرین صرف اس حصے کو سامنے رکھ کر تفسیر کرنے لگتے ہیں:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا

ترجمہ: اور تحقیق اس عورت (زلیخا) نے اس (یوسف) کا قصد کیا اور اس (یوسف) نے بھی اس عورت (زلیخا) کا قصد کیا۔

الامان، استغفراللہ، یہ مفہوم لینا بہت بڑی جہالت ہے۔اصل جملہ یوں ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ

اس عورت نے تو اس (یوسف) کا قصد ضرور کیا

وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ

اور وہ (یوسف) بھی اس (عورت) کا قصد کرتے اگر انھوں نے اپنے رب کی برہان نہ دیکھی ہوتی۔

یعنی کیونکہ ان کی نظر اپنے پروردگار کی برہان پر تھی اس لیے انھوں نے اس عورت کی تمنا نہیں کی۔ بلاعت کے اصولوں سے نابلد راویوں، مفسروں اور مورخوں کو اس جملے کی وجہ سے طرح طرح کی باتیں کرنی پڑیں۔ کسی نے کہا عورت نے تو یوسف کو پانے کا ارادہ کیا لیکن یوسف نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا اور کسی نے کہا کہ اس نے یوسف کو پانے کا ارادہ کیا اور یوسف نے اس سے بچنے کا ارادہ کیا اور کسی نے کچھ اور کہا۔ان تمام تکلفات کی ضرورت نہیں کیونکہ عبارت تو کہتی ہے کہ اپنے رب کی برہان پر نظر رکھنے کی وجہ سے یوسف نے زلیخا کا قصد ہی نہیں کیا۔

قرآن حکیم میں اس معنی پر تاکید کرنے والے دیگر دلائل بھی موجود ہیں۔مثلاً:

(i) كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ والفحشاء

ترجمہ: "یہ برہان انھیں مہیا کرکے ہم نے انھیں برائی اور ہوسناکی سے بچا لیا۔"

یہ برائی اور ہوسناکی وہی ہے جس کا ارادہ زلیخا نے کیا تھا ''لِنَصْرِفَ عَنْهُ۔۔۔'' کا معنی یہی ہے کہ تاکہ ہم منصرف کردیتے اور پلٹا دیتے یوسف سے برائی اور فحشا کو۔

(ii) مزید اسی آیت میں ہے:

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ترجمہ: "بے شک وہ ہمارے مُخلَص بندوں میں سے ہیں۔"

یہ امر لائق توجہ ہے کہ کلمہ "مُخلَص" مفعول ہے یعنی چنے ہوئے اور خالص کیے گئے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوسف پہلے ہی خدا تعالیٰ کے برگزیدہ اور چنے ہوئے بندے تھے۔

(iii) اس سے پہلے بھی فرمایا گیا ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (یوسف/۲۲)

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب وہ بالغ ہو گئے تو اللہ نے انھیں حکمت و علم سے نوازا اور اللہ کا یہ نوازنا اس لیے تھا کہ وہ نیکو کار لوگوں میں سے تھے اور اللہ حسن عمل رکھنے والوں کو اسی طرح جزا دیتا ہے۔

گویا وہ زیر بحث واقعے سے پہلے ہی حکمت و علم کے حامل تھے۔اسی بات کو امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک حدیث بھی تقویت دیتی ہے جس میں آپ نے برہان سے نبوت مراد لی ہے یعنی اس وقت حضرت یوسفؑ منصب نبوت پر فائز تھے۔چنانچہ اس مقام پر امام صادقؑ برہان کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

النبوۃ المانعۃ من ارتکاب الفواحش۔[5]

ترجمہ: "وہ نبوت جو روکنے والی تھی فواحش کے ارتکاب سے۔"

البتہ نبوت کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس کا ارادہ نہ کرنے پر مجبور تھے بلکہ اس موقع پر بھی اپنی معرفت الٰہی کی وجہ سے انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے دیا۔یہی سبق ہے اس واقعے میں کہ ایسے موقع پر بندوں کو چاہیے کہ اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دیں اور اس کی رضا و عظمت پر نظر رکھیں۔

چند معروضات

یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ عصمت انبیاء کے لیے ضرورت عصمت اور عصمت کی حقیقت کے بارے میں ہم نے الگ گفتگو کی ہے۔لہٰذا پیش نظر مقالے کو اپنے موضوع کی حدود میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔نیز آنحضرتؐ کی عصمت کے حوالے سے ایک مقالہ پہلے ہی نور معرفت کے صفحات میں ''عصمت خاتم الانبیاؐ'' کے زیرعنوان شائع ہو چکا ہے۔نیز حضرت آدمؑ کے حوالے سے بھی الگ سے ایک مقالے کی ضرورت ہے چونکہ ہمارے نقطۂ نظر سے ان کا موضوع دیگر انبیاء علیہم السلام کے موضوع سے مختلف ہے اور نسبتاً وسیع تر مطالعے اور تحقیق کا متقاضی ہے۔اس لیے اسے پیش نظر مقالے کا حصہ نہیں بنایا گیا۔

حوالہ جات

---

1 ۔ فراہی، حمید الدین: حقیقت دین (لاہور، دارالتذکیر، ۱۹۹۸) ص، ۴۷و۴۸

2۔ بحار الانوار، ج۱۱، ص ۳۳۷

3 ۔ تفسیر نور الثقلین، ج۲، سورہ ہود کی تفسیر کے ذیل میں

4 ۔ بحار الانوار، ج۱۱، ص ۷۹

5 ۔ رازی، فخر الدین (م۶۰۶ھ): عصمۃ الانبیاء (قم، ایران، مطبعۃ الشہید، طبع، ۱۴۰۶ھ) ص ۵۸
نیز طبرسی (م۵۴۸): تفعسیر مجمع البیان (بیروت، لبنان، موسسہ الاعلمی للمطبوعات، طبع اول ۱۹۹۵) ج۵، ص ۳۸۷۔